بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

نشۂ اقتدار میں بدمست، مضبوط کرسی کے مالک، غریبوں، کسانوں اور مزدوروں کی محبت کا دم بھرنے والے، برّاعظم ایشیا کی قیادت اور تیسری دنیا کی رہنمائی کے دعویدار مسٹر بھٹو بہ حسرت تمام یکایک شاہانہ اختیارات سے محروم ہوگئے۔ اُن کی اقتدار سے علیحدگی حسرتناک بھی ہے اور عبرت انگیز بھی۔ ہم اسے حسرت ناک اس بنا پر قرار دیتے ہیں کہ اگر وہ دھونس دھاندلی کے ذریعہ عوام کی گردنوں پر بالجبر مسلط رہنے پر اصرار نہ کرتے اور اُن کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر مسندِ اقتدار سے از خود الگ ہو جاتے تو وہ ملک کی سیاسی زندگی میں ایک صحت مند روایت قائم کرنے والے کی حیثیت سے ہمیشہ یاد کیے جاتے۔ مگر افسوس کہ وہ اپنے نبض شناسی کے دعوے کے باوجود عوامی تحریک کے تقاضوں کا احساس کرنے سے یکسر قاصر رہے اور عوام کی خواہشات کے علی الرغم ایسا فسطائی طرزِ عمل اختیار کیا جس سے بالآخر انھیں مسندِ اقتدار چھوڑنی پڑی۔

ہم اُن کی اس سیاسی موت کو عبرت انگیز اس لیے سمجھتے ہیں کہ وہ جس فلسفۂ استبداد کے پرچارک تھے اور ظلم و تعدی کی جس راہ پر گامزن رہے اور اپنے متبعین کو گامزن رہنے کی تلقین کرتے رہے اُس سے کبھی کسی قوم کو فلاح نصیب نہیں ہوئی۔ ماضی میں بھی قوموں کو اس گمراہ کن فلسفے نے تباہ کیا اور حال میں بھی کئی ممالک اس کی تباہ کاریوں کا نہایت بھیانک نقشہ پیش کر رہے ہیں۔ خود جسدِ پاکستان کو اس انسانیت سوز نظریے نے جو چرکے لگائے ہیں اور استبداد کے علمبردار ملک غلام محمد، اسکندر مرزا، ایوب خان، یحییٰ خان اور مجیب جس عبرتناک انجام کو پہنچے ہیں اُس سے کون ناواقف ہے، مگر صد حیف کہ بھٹو صاحب استبداد کے

ہاتھوں پاکستان کی تباہی کے سنگین واقعات اور آمروں کا المناک حشر خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود تاریخ سے کوئی سبق حاصل نہ کر سکے اور اپنے لیے اُسی ظالمانہ روش کو پسند کیا جو خدا کی رحمت کو نہیں بلکہ اس کے غضب کو دعوت دیتی ہے اور جس کی وجہ سے باری تعالیٰ نافرمان افراد اور قوموں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے کیونکہ اس کے ہاں قاعدہ یہ ہے کہ جو بدکردار لوگ دوسروں کے انجام سے عبرت نہیں پکڑتے انہیں خود دوسروں کے لیے سامانِ عبرت بنا دیا جاتا ہے۔

بھٹو صاحب گو ایک فرد ہیں مگر ان کا آمرانہ طرزِ فکر اور جابرانہ طرزِ عمل ایک مخصوص بیمار ذہن کی غمازی کرتا ہے جسے اَنَا وَلَا غَیْرِی کے بلیغ جملے میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ سمو یا گیا ہے۔ جس غیر انسانی روش کو ہم آج استبداد کہتے ہیں اور جس کی قہرمانیوں نے کرۂ ارضی کے بیشتر حصے کو جہنم آسا بنا دیا ہے وہ خود غرضی کی کوکھ سے نمودار ہوتی، خود پسندی کی آغوش میں نشوونما پاتی اور انسان کی حد سے بڑھی ہوئی انانیت اُسے قوت و توانائی بخشتی ہے اور اس کے تنومند ہونے کے ساتھ ہی دُنیا میں ظلم، ناانصافی اور سفاکی کا دَور دَورہ شروع ہو جاتا ہے۔

لفظ " استبداد " فعل استبد کا مصدر ہے جس کے معنی ہیں وہ الگ یا بے نیاز ہو گیا یا اس نے کسی کام یا معاملے میں دوسروں کو شریک بنانے کی ضرورت محسوس نہ کی یا اُس نے کسی معاملے میں اس حد تک اختیار حاصل کرنا چاہا کہ کسی دوسرے فرد کی رائے کی پیروی کرنا تو کجا اُسے سُننا تک گوارا نہ ہوا۔ اپنے لیے لوگوں سے ترجیحی سلوک کی آرزو ابتدائی مرحلے میں انسانی خودی کا ایک فطری تقاضا ہے، لیکن اثباتِ خودی کا یہ معصوم سا جذبہ جب اپنی جائز حدود پھلانگ کر خود غرضی کے وسیع میدان میں اپنی جولانیاں دکھانی شروع کرتا ہے تو انسان اپنی فطرت سے انحراف کر کے بگاڑ کی راہ پر بگٹٹ چل نکلتا ہے۔ پھر وہ صرف اثباتِ ذات کا خواہش مند نہیں رہتا، بلکہ اِس بات کا طالب ہوتا ہے کہ اِس کائنات میں تنہا اُس کی ذاتِ گرامی ہی کو مرکزی مقام حاصل ہو اور باقی مخلوق اُس کی خدمت اور چاکری کے لیے وقف ہو جائے۔ دوسرے انسان اگر جئیں تو صرف اُس کی حمد و ثنا اور اطاعت گذاری کے لیے، اِس دُنیا کی جو چیز یا جو فرد کائنات کے اِس مرکزی کردار کا یہ مطالبہ ماننے میں ذرا متامّل نظر آئے تو اُسے فی الفور نیست و نابود

کر دیا جائے، کیونکہ وہ اُس کے توسیع پسندانہ عزائم کی راہ میں حائل ہو کر فطرت کے بلیے چوڑے منصوبوں کو خاک میں ملا رہا ہے۔

یہ ہے مختصر اور سادہ الفاظ میں کسی مستبد کے سوچنے کا نقطۂ آغاز اور نقطۂ انحراف اور اُس کے طرزِ استدلال کا منطقی مغالطہ۔ مگر ظاہر بات ہے کوئی خود پسند شخصیت اپنی اس خود پسندی اور اس کے نتیجہ میں اُبھرنے والے ناپاک عزائم کو عوام کے سامنے واضح طور پر پیش کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی، چنانچہ وہ اپنی بگڑی ہوئی انا کی تسکین کے لیے شیطان کی پیروی میں کچھ ایسی چالیں چلتی اور ایسے ہتھکنڈے استعمال کرتی ہے جو بظاہر بڑے معصوم دکھائی دیتے ہیں، مگر بباطن انتہائی خوفناک ہوتے ہیں۔

لوگوں پر اپنی ذات کو ترجیح دینے کی خواہش جب کچھ زور پکڑتی ہے تو خود پسندی کا روپ دھار کر نمودار ہوتی ہے اور انسان ایک ایسا طرزِ عمل اختیار کرتا ہے جس سے اپنی ذات کے لیے ترفع اور نمائش اور دوسرے کے لیے نفرت اور حقارت کی بُو آتی ہے۔ لیکن مستبد اپنے اس ذہنی عارضے کو نہایت چالاکی سے اپنی فکری برتری ثابت کرتا ہے۔ وہ روزمرّہ کے مشاہدہ کی بنا پر عوام کے سامنے یہ استدلال پیش کرتا ہے کہ چونکہ سب افراد کو فطرت کی طرف سے یکساں صلاحیتیں عطا نہیں ہوئیں، بعض لوگوں کو بہ زیادہ تعداد اور وافر مقدار میں ودیعت کی جاتی ہیں اور بعض کو ان سے کسی قدر محروم رکھا جاتا ہے، اس بنا پر جن افراد کو ان صلاحیتوں کا زیادہ حصّہ ملتا ہے انہیں یہ حق حاصل ہے کہ کم صلاحیت رکھنے والے افراد پر اپنی برتری قائم کریں۔ اُن کا یہ طرزِ استدلال بڑا بودا ہے لیکن وہ اس سے خوب فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

افراد کے مابین صلاحیتوں کے اعتبار سے یہ تفاوت فطرت کی کسی غیر عادلانہ تقسیم کا نتیجہ نہیں، بلکہ علیم و حکیم ذات کا حیاتِ اجتماعی کے قیام کے لیے ایک متوازن منصوبہ ہے۔ انسانوں میں خداداد صلاحیتوں کی یکسانی اجتماعی زندگی کے وجود کے لیے مشکلات پیدا کرتی ہے۔ اس لیے رحیم و کریم ذات نے مختلف انسانوں کو مختلف صلاحیتوں سے نوازا ہے تاکہ بکھرے ہوئے افراد ان صلاحیتوں کی کمی بیشی کی وجہ سے ایک دوسرے کے مددگار بن کر صحت مند معاشرہ کی داغ بیل ڈال سکیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قدرت نے اپنے عطیات تقسیم کرنے میں ہر فرد کے ساتھ بڑا فیاضانہ برتاؤ کیا

ہے۔ لیکن تمام افراد کو جو عطیات دیے ہیں اُن کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ اسی بنا پر بعض کوتاہ بین یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے اگر انہیں ذہانت اور فطانت سے نوازا ہے تو اس کا منشا یہ ہے کہ وہ دوسروں پر حکومت کریں اور دوسرے تاحینِ حیات ان کا پانی بھرتے رہیں۔

بہتر صلاحیتوں کے زعم میں عوام پر حقِ حکمرانی کا دعویٰ ممکن ہے بعض افراد کے لیے ذہنی طور پر بڑا دلفریب ہو، مگر اس دعویٰ کو میدانِ عمل میں عوام سے تسلیم کروانا بڑا جان جوکھوں کا کام ہے۔ کسی فرد یا گروہ کا اپنے آپ کو صاحبِ صلاحیت سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں۔ ہزاروں افراد اپنی قابلیت اور استعداد کے بارے میں غلط اندازے لگا کر معاشرے سے عجیب و غریب مطالبات کرنے لگتے ہیں، لیکن اُن میں سے بہت کم خوش نصیب ایسے نکلتے ہیں جن کے یہ مطالبات معاشرہ پورے کرنے پر آمادہ ہوتا ہے، خصوصاً سیاسی قیادت و رہنمائی کے میدان میں ایسے لوگوں کا یہ مطالبہ کہ چونکہ وہ فطانت میں دوسرے لوگوں سے برتر ہیں، اس لیے دوسرے افراد برضا و رغبت اُنہیں اپنے اُمور کا والی بنا لیں، مشکل ہی سے پورا ہوتا ہے بلکہ یہی وہ ناجائز مطالبہ ہے جس سے معاشرے میں آویزش شروع ہوتی ہے۔

اپنی برتری کا دعویٰ اور اس دعویٰ کی بنیاد پر اپنے لیے خصوصی مراعات کا مطالبہ یوں تو زندگی کے ہر شعبے میں مختلف لاینحل مسائل اور الجھنیں پیدا کرتا ہے، لیکن سیاسی میدان کے علاوہ کہیں بھی دہشت گردی کو جنم نہیں دیتا۔ ایک شخص اپنے آپ کو ایک عظیم ادیب یا عظیم شاعر یا عظیم صحافی یا وسیع معلومات رکھنے والا عالم یا بے مثال سائنس دان سمجھتا ہے اور اس بناء پر معاشرے سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ نہ صرف اُس کی مناسب عزت افزائی کرے بلکہ اس کے مرتبہ و مقام کے مطابق اُسے زندگی کی سہولتیں بھی بہم پہنچائے۔ معاشرہ اُس کے اِس دعویٰ کی صداقت معلوم کرنے کے لیے کہ آیا اس کے کارنامے فی الحقیقت اُسی قدر و قیمت کے حامل ہیں جس کا وہ خود مدّعی ہے، اُس کے کارناموں کا جائزہ لیتا ہے، پھر اُن کی قدر و قیمت طے ہو جانے کے بعد صاحبِ صلاحیت فرد کو زندگی کی مراعات بہم پہنچاتا ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی ادیب، شاعر، صحافی اور سائنس دان پراپیگنڈہ کے فن میں ماہر ہونے یا انجمن ستائشِ باہمی کی برکت سے اپنا قد کاٹھ بڑھانے میں کامیاب ہو جائے اور سوسائٹی میں کوئی ایسا بلند مقام حاصل کرلے جس کا وہ فی الحقیقت مستحق نہ ہو اور اِس طرح اُسے اپنے جائز حصّے سے زیادہ مراعات حاصل ہو جائیں،

لیکن اُس کا یہ ناپسندیدہ طرزِ عمل معاشرے میں سفّاکی اور زیردست آزاری کی عملداری قائم نہیں کرتا کیونکہ تفوق اور برتری کا دعویدار پندارِ نفس کے باوجود اپنے کسی مطالبہ کو جبر و تشدد سے منوا نہیں سکتا۔ معاشرہ اسے جو مراعات دیتا ہے برضا و رغبت دیتا ہے۔

سیاسی زندگی میں البتہ یہ صورت یکسر تبدیل ہو کر سامنے آتی ہے۔ یہاں جس شخص کے ذہن میں یہ سودا سماتا ہے کہ وہ اَبنائے جنس کے مقابلے میں زیادہ ذہین و فطین ہے، اُس کے دل میں یہ اُمنگ بھی ضرور انگڑائی لیتی ہے کہ اُسے دوسرے افراد پر لازمی طور پر حکومت بھی کرنی چاہیے تاکہ وہ اپنی برتر ذہنی استعداد کے بل بوتے پر معاشرہ کے مسائل کو بہتر انداز میں حل کر سکے۔ مگر یہاں دقت یہ پیش آتی ہے کہ عوام اُس کے دعوے کو آسانی سے ماننے پہ آمادہ نہیں ہوتے۔ وہ کوئی فلسفی، شاعر، ادیب یا سائنس دان نہیں ہوتا کہ نقاد از خود اُس کے فکر و فن یا اُس کے اکتشافات کی قدر و قیمت متعین کر کے معاشرے میں اُسے اُس کا صحیح مقام دلوا سکیں۔ چنانچہ ایک سیاست دان جب کسی معاشرے میں اپنی برتری کا دعویٰ لے کر اُٹھتا ہے تو وہ اپنے اس دعوے کی صداقت تسلیم کروانے کے لیے معاشرے کے اصحابِ بصیرت کی طرف رجوع نہیں کرتا بلکہ عوام کو اپنی شخصیت کے افسوں میں گرفتار کرنے کے لیے عجیب و غریب حرکات کرتا اور دلچسپ چالیں چلتا ہے۔ اس کی تگ و تاز کا مقصد چونکہ یہی ہوتا ہے کہ لوگوں کو کسی نہ کسی طرح اپنے فوق البشر ہونے کا یقین دلا یا جائے اس لیے وہ اپنی ذات اور اپنی صلاحیتوں کے بارے میں عوام کے اندر حیرت انگیز افسانے پھیلا کر انہیں باور کراتا ہے کہ خدا کا اُن پر یہ احسانِ عظیم ہے کہ اُس نے انہیں غیر معمولی صلاحیتوں اور ملکوتی صفات رکھنے والا ایک بے مثال قائد دے دیا ہے۔ اُنہیں اِس نعمت کی پوری پوری قدر کرنی چاہیے اور اُسے جلد از جلد اپنے سیاہ و سپید کا مالک بنا کر یہ موقع فراہم کرنا چاہیے کہ وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اُن کی بگڑی بنانے میں مصروف ہو جائے۔ اپنی شخصیت کا طلسم قائم کرنے کے لیے ایک عیّار سیاستدان عوام کے اندر یہ گمراہ کن تاثر پھیلانے کی بھی پوری کوشش کرتا ہے کہ اُس کی سربراہی عوام کے سارے دکھوں کا مداوا ہے، اُن کی ترقی اور خوشحالی کی واحد ضمانت ہے، اندرونی اور بیرونی خطرات کے مقابلے میں ایک زبردست ڈھال ہے۔ وہ اگر مصائب اور پریشانیوں سے محفوظ رہ کر امن و امان اور عزت و آبرو کی زندگی گذارنے کے متمنّی ہیں تو اِن کی ایک ہی صورت ہے کہ وہ

خوش دلی کے ساتھ آنکھیں بند کر کے اپنے گلے میں فوق البشر کی غلامی کا طوق ڈال لیں اور اگر انہوں نے ایسا کرنے سے گریز کیا تو پھر آسمان اپنی ساری آفتوں کے ساتھ اُن پر ٹوٹ پڑے گا اور زمین اپنی ساری وسعتوں کے باوجود اُن پر تنگ ہو جائے گی اور اس کائنات میں کوئی اُن کا پرسانِ حال نہ ہوگا۔ دنیا کا ہر آمر مستبد اور جابر جھوٹے پراپیگنڈے کی مدد سے اپنے حق میں اسی قسم کے گمراہ کن تاثرات پھیلاتا ہے اور عوام کو ذہنی طور پر اس بات پر تیار کرتا ہے کہ وہ اس کی سیادت اور حکمرانی کو ایک انتہائی ناگزیر امر سمجھ کر بمسرت تمام قبول کر لیں۔

ظاہر بات ہے کہ کسی فرد کے بارے میں عوام کے ذہنوں میں اس قسم کے غلط تاثرات بٹھانا کوئی آسان کام نہیں۔ اس بنا پر دنیا کا ہر آمر اپنے ذاتی، جماعتی اور قومی وسائل کا بیشتر حصہ بلاواسطہ یا بالواسطہ اپنے حق میں پراپیگنڈے پر صرف کرتا ہے تاکہ معاشرے میں اُس کی شخصیت کا نقش اس حد تک نمایاں ہو کہ لوگوں کے ذہن اُس ایک شخصیت کے علاوہ کسی دوسری ذات کی طرف متوجہ نہ ہونے پائیں۔ کسی شخصیت کے بارے میں جھوٹے طلسمات کا تانا بانا، دجل و فریب، کذب و دروغ گوئی ہی سے تیار ہوتا ہے۔ اس لیے ہر آمر عیاری اور مکاری اور پراپیگنڈے کے فن میں مہارت تامہ رکھتا ہے۔ وہ کوئی کام خلوصِ نیت سے نہیں کرتا، بلکہ اُسے ہمیشہ یہی فکر دامن گیر رہتی ہے کہ عوام کے اندر اس کی ایسی کارروائیوں کا چرچا ہوتا رہے جن سے عوام کو اُس کے فوق البشر ہونے کا یقین آجائے۔ چنانچہ مستبد اور آمر ٹھوس اور دُور رس نتائج پیدا کرنے والے ایسے اقدامات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے جو پراپیگنڈے کے نقطۂ نظر سے اُن کے لیے غیر مفید ہوں۔ بلکہ معاشرے کو ایسے کاموں میں مصروف رہنے کا تاثر دیتے ہیں جو نمائشی ہونے کی وجہ سے عوام کے لیے جاذبِ نظر ہوں اور اخبارات کی شہ سرخیاں بن سکیں۔

جس طرح کوئی شخص صرف ہوا پر زندہ نہیں رہ سکتا، اسی طرح کوئی معاشرہ حکمرانوں کی محض لن ترانیوں پر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ حقائق بہر حال حقائق ہی ہوتے ہیں اور انہیں آمروں کی لاف و گزاف سے بدلا نہیں جا سکتا۔ بلند بانگ دعوے آخر عمل کی کمی کو کس طرح پورا کر سکتے ہیں؟ چنانچہ ان دعووں کی حقیقت جلد ہی کھل کر عوام کے سامنے آجاتی ہے اور وہ حیران ہو کر پوچھتے ہیں کہ اگر ملک ان آمروں اور اُن کے مصاحبین

کی زیرِ قیادت برق رفتاری سے ترقی کر رہا ہے تو اس کے باشندوں کے حالات رو بہ اصلاح کیوں نہیں ہوتے، دوسرے ممالک کی نظر میں ملک کا وقار کیوں بلند نہیں ہوتا، عوام کے اندر مستحکم معیشت، صاف ستھری سیاست اور امنِ عامہ کی بہتر صورتِ حال کی وجہ سے خود اعتمادی کیوں پیدا نہیں ہوتی اور ان کے اندر کا اضطراب، سکون و اطمینان میں اور عدم تحفظ کا احساس حفاظت و سلامتی میں اور بیزاری، اخوت و مودّت میں کیوں تبدیل نہیں ہوتی۔ عوام کے اندر جس نسبت سے یہ احساسِ محرومی بڑھتا ہے اسی تناسب سے مستبد پراپیگنڈے کی مشینری کو تیز کرتا ہے، دلفریب نعروں اور دعووں کا کوٹہ بھی بڑھا دیتا ہے اور ہر ایسی چال چلتا ہے جس سے لوگوں پر اس کی شخصیت کا سحر ٹوٹنے نہ پائے۔

تلخ حقائق جب مستبد کی ساری کوششوں کے علی الرغم تیزی کے ساتھ عوام کے سامنے آتے ہیں اور ان سے اغماض برتنا کسی طور ممکن نہیں رہتا تو پھر آمر ان حضرات کو ٹھکانے لگانے کی فکر کرتا ہے جو اس کے نزدیک عوام کو اصل حقائق سے آگاہ کرکے انہیں بیدار کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ جس طرح ایک نیام میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں، بالکل اسی طرح کوئی مستبد اس بات کا تصور بھی نہیں کرسکتا کہ اس کی موجودگی میں کوئی دوسرا شخص یا طبقہ عوام کی توجہ کا مرکز بن سکے۔ اس لیے جب بھی وہ کسی سمت سے اس طرح کا کوئی خطرہ محسوس کرتا ہے تو پہلے مرحلہ پر وہ اس کی کردار کشی کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہے تاکہ اُفقِ سیاست پر ابھرنے والے شخص کی سیرت داغدار دکھائی دے اور اس کا روشن چہرہ عوام کو یکسر تاریک نظر آئے۔

کردار کشی کا یہ مکروہ دھندا اگرچہ ہر آمر کا دل پسند اور محبوب مشغلہ ہوتا ہے، اور وہ اسے آخری لمحہ تک جاری رکھتا ہے لیکن تھوڑی مدت کے بعد ہی عوام کے اندر اس کے اثرات زائل ہونے شروع ہوجاتے ہیں اور ان پر یہ حقیقت عیاں ہوجاتی ہے کہ حکمران اپنے چہروں کی سیاہی چھپانے کے لیے دوسروں کے روشن و تابندہ چہروں پر کالک مل رہے ہیں اور یہ سب جھوٹ، فریب، صریح ظلم اور ناانصافی ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر آمر کی جھنجھلاہٹ اپنی آخری حد کو پہنچتی ہے اور جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ اس کا سارا پراپیگنڈا بیکار ثابت ہو رہا ہے اور اس کی ساری معاندانہ کارروائیوں کے باوجود (باقی برصفحہ ۴۸)